ٹیکنالوجی

اس چھوٹی سڑک پر ٹریفک کم رہتا' کیونکہ مین شاہراہ اور اس سڑک کے درمیان ایک سوکھے نالے کی گزرگاہ تھی۔ برساتیں آتے ہی اس سوکھے نالے میں پانی ٹک جاتا اور پانی اترنے کے بعد یہاں خودرو گھاس' برھمی بوٹی' دستار قاضی اور بچھو بوٹی اگ آتی۔ ایسی خودرو پالک کا ساگ بھی اگا رہتا جسے افغانی عورتیں توڑ کر جھولے میں بھرتی نظر آتیں۔

چھوٹی سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹا بازار تھا' جس کے اندر دو تین کچی گلیاں جاتی تھیں۔ گو بازار کے سامنے یہ سڑک پکی تھی لیکن اس میں بڑے بڑے گڑھے تھے۔ بازار والوں نے اپنے اپنے سیورج کے لئے عین سڑک میں نالیاں کھود کر انہیں بھرنے کی زحمت نہ کی تھی۔ اس لئے ادھر سے کوئی جیپ' کار' ٹرک یا کیریئر گزرتا ڈوج کرتا ہوا نظر آتا۔ اس بازار میں تمام دکانیں بی کلاس تھیں۔ جہاں سے یہ چھوٹی سڑک مڑ کر شاہراہ سے ملتی تھی' ایک یونانی دواخانہ تھا۔ اس سے متصل بزاز کی دکان تھی۔ اس دکان کے آگے درزی بھی بیٹھتا تھا اور چونکہ اس کا زیادہ دن بیٹھ کر گزرتا اس لئے اسے چورن' معجون' پھنکیوں کی ضرورت پڑتی رہتی۔ ان دو دکانوں سے آگے عمارتی سامان کی دکان تھی۔ یہاں کا دکاندار اپنے تئیں پیسے والا اور مغرور تھا۔ لوڈشیڈنگ کے وقت وہ جنریٹر لگا کر اپنی بتی آن کر لیتا اور سارے بازار والے اس کی امارت سے سہم جاتے۔ اس دکان سے تین دکانیں آگے عالم سائیکل والے کی ریپئر شاپ تھی۔ اس دکان میں کولتار کا کوئی کام نہ تھا لیکن یوں احساس ہوتا یہاں سے کولتار کا گزر ضرور ہوا ہے۔ چھت اور دیواریں دھوئیں کی غماز تھیں۔ بڑے بڑے

کیلوں پر پرانے اور نئے سیاہ ٹائر ٹنگے تھے۔ چند کرائے کی سائیکلیں اور ایک چارپائی پر ڈھیر ساری سپوکیں' ڈھبریاں' ناکارہ ٹیوبیں' گیئر باکس پڑے تھے۔

عالم کے پاس دو چھوٹے تھے جو بھاگ بھاگ کر پنکچر لگاتے' ٹیوبیں بدلتے اور سائیکلوں پر کپڑا پھیر کر گاہکوں کو پکڑاتے۔ اس چھوٹی سڑک پر ٹریفک کم ہونے کی وجہ سے یوں بھی گاہک کم لگتا تو عالم لوہے کی چوکور کرسی پر بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ سردیوں میں سوکھے نالے کے اندر جہاں خودرو بر ممی بوٹی' دستار قاضی اور بچھو بوٹی اگی رہتی تھی اس جگہ دری بچھا کر عالم اپنے مطالعے کی کتابیں رکھ کر پڑھنے میں مشغول رہتا اور حجام اللہ دتہ سے دور رہتا جو اخبار کی طرح کل عالم سے واقفیت رکھتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا عالم کو بچپن سے شوق تھا۔ وہ چھپے ہوئے مواد پورے اعتقاد سے پڑھتا تھا۔ کتاب دیکھتے ہی تحیر میں چلا جاتا اس کے لفظ لفظ پر عالم کا ایمان پختہ ہوتا رہتا۔ شروع شروع میں عالم نے ادھر ادھر سے مانگ کر جاسوسی ناول' ڈائجسٹ اور اسلامی ناول پڑھے پھر وہ ایک چھوٹی سی لائبریری کا ممبر بن گیا اور اس لائبریری سے کرائے پر کتابیں لانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا تخیل ان کتابوں تک محدود نہ رہ سکا اور کتابوں کی طلب نے ہی اسے نوید کا دوست بنا دیا۔

نوید نے اپنے گھر میں لائبریری کھول رکھی تھی۔

چھوٹی سڑک سے ملحق بازار میں سے تین کچے راستے پچھلی آبادی میں جاتے تھے۔ یہ نہ تو کچی آبادی تھی نہ ہی اسے کچھ منظم بستی کہا جا سکتا تھا۔ یہاں گلیاں تھیں اور نشیب و فراز پر کچے اور پکے گھر بنے ہوئے تھے۔ بارشوں میں کچے راستوں پر پانی' کیچڑ اور کوڑا ہوتا۔ اسی بستی میں فیروزی مائل سبز کھڑکی اور دروازے والا پکا صاف ستھرا مکان نوید کا تھا۔ کچی گلی میں دو پختہ سیڑھیوں پر چڑھ کر آگے دروازہ تھا جس پر فیروزی مائل سبز چمکدار پینٹ اور آنہ لائبریری کا بورڈ لگا تھا۔ نوید شوقین آدمی تھا۔ شاہراہ سے بس پکڑ کر ایک پریس میں کام کرنے جایا کرتا۔ وہ شہر سے ایک کال بل لے آیا تھا جو دروازے کے ساتھ لائبریری کے بورڈ کے ساتھ آویزاں تھی۔ جب کوئی لائبریری سے کتابیں لینے آتا' نوید کی لگائی ہوئی گھنٹی کا بٹن بجاتا اور اندر سے نوید پردہ پیچھے کر کے دروازہ کھولتا۔

نوید بڑا شوقین آدمی تھا۔ اس نے گھر کا صحن اور پچھلے دو کمرے تو اپنی بیوی بچے کے لئے وقف رکھے تھے لیکن گلی میں کھلنے والے اس چھوٹے کمرے کو لائبریری بنا لیا تھا۔ یہ کمرہ اس قدر نشیب میں تھا کہ ایک برساتوں میں تو اس میں پانی بھی کھڑا ہو گیا تھا' جسے کئی گھنٹے لگ کر نوید نے بالٹیوں سے خالی کیا۔ فیروزی مائل سبز دروازے کے آگے میرون رنگ کا پردہ تھا جسے مشین مین نوید اپنے اوور ٹائم کے پیسے جمع کر کے میو ہسپتال کے پچھواڑے سے خرید کر لایا۔

جس روز پہلی مرتبہ عالم نے کال بل بجائی' ہلکی ہلکی بارش ہو چکی تھی۔ کال بل کی آواز پر نوید نے دروازہ کھولا۔ میرون پردے پیچھے کئے اور عالم کو اندر آنے کے لئے کہا۔ کمرے کے اندر اترنے کے لئے بھی تین سیڑھیاں تھیں اور نیچے اینٹوں والے فرش پر چھوٹی سی دری بچھی تھی۔ عالم نے پہلی سیڑھی پر اپنے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں لائبریری میں اترا۔

نوید اس لائبریری کے لئے زیادہ کتابیں انارکلی کے سامنے لگنے والے سیکنڈ ہینڈ بکس کے تھڑے بازار سے لایا تھا۔ ان کتابوں پر اس نے بڑے سلیقے سے براؤن کاغذ چڑھا کر سفید چیپیاں لگائی تھیں اور ان پر کتابوں کا نمبر اور رائٹر کا نام بھی نوٹ کیا تھا۔ دو جستی ٹرنک' ایک الماری اور تین کرسیوں سے پوری لائبریری آراستہ تھی۔ بیٹھنے اور ذوق ڈسکس کرنے کے لئے دری موجود تھی۔ جب عالم لائبریری کا ممبر بن گیا تو تبادلہ خیال کے ضمن میں یہی دری سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی۔ ایک روز جب عالم کچھ ناول لوٹانے آیا تو نوید نے اسے چھوٹی پیالی میں دودھ پتی پیش کی اور اور دری پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

"اگر آپ کو کبھی کرائے کی سائیکل درکار ہو تو عالم سائیکل شاپ سے لیا کریں' میں چھوٹوں کو بتا دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ" نوید نے رجسٹر میں تاریخ' کتاب اور رائٹر کا نام بڑی خوبصورت لکھائی میں نوٹ کیا۔

"کیا آپ میری کچھ راہبری کر سکیں گے.... میں کچھ افسانے پڑھنا چاہتا ہوں' لیکن ایسے افسانے جو مختلف قسم کے ہوں——"

نوید پریس میں کام کرتا تھا اور اسے آٹھ برس سے لائبریری بنانے کی دھن بھی سوار تھی۔ اسی ضمن میں اس نے پنجاب پبلک لائبریری کا کارڈ بھی بنوا رکھا تھا۔ اس نے عالم کو منشی پریم چند سے لے کر علامتی افسانے تک ایک چھوٹا موٹا لیکچر دے دیا۔

کچھ دیر عالم یہ کہانیاں پڑھتا رہا لیکن پتہ نہیں کیسے اور کیوں وہ شاعری کے میدان میں گھس گیا۔ اب وہ چھوٹوں کو بھی کچھ کہتا تو اکبر الہ آبادی یا حالی کا شعر ضرور ٹانک دیتا۔ مدوجذر اسلام اور شہنامہ اسلام اس کے سرہانے دھری رہتیں۔ کبھی کبھی رات کے وقت جب وہ دکان کی اکلوتی چارپائی خالی کر کے لیٹتا تو علامہ اقبال کی شاعری پڑھنے میں اسے آدھی رات گزر جاتی۔ وہ نوید سے اس بات کا ذکر تو نہیں کر سکتا تھا لیکن علامہ کے کسی کسی شعر پر اسے اتنا رونا آتا کہ سسکیوں سے اس کا سینہ بھر جاتا۔

ان ہی دنوں جب وہ شاعری کی مئے ناب سے سرخا سرخ ہو رہا تھا' بزاز کی دکان پر درزی کے پاس بستی کی جانب سے ایک لڑکی آئی۔ اس وقت لوڈ شیڈنگ کا وقت تھا۔ عمارتی سامان والے ارشد نے بڑی مستعدی سے اپنا جنریٹر دکان سے باہر لگا دیا اور گو شام کے اس وقت روشنی کی ضرورت نہیں تھی لیکن ارشد کی دکان میں بجلی جل رہی تھی۔ عالم یونانی دواخانے کے سامنے کھڑا حکیم جی سے اپنے زکام کے لئے اسطخدوس کی پڑیا بندھوا رہا تھا۔

شام تھی اور کیسری لباس میں ملبوس لڑکی نے شاید کسی خوشبودار صابن سے غسل بھی کیا تھا۔ حکیم جی کے مطب تک تازہ پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس خوشبو نے عالم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ماسٹر جی میں نے یہ کرتا بسنت کے دن پہننا ہے۔"

"ہاں جی سمجھ گیا ہوں۔"

عالم نے اس طرف منہ کر لیا جدھر جنریٹر چل رہا تھا اور لڑکی کو دیکھا۔ اس کے بال گیلے تھے اور کمر کا کافی حصہ نم ہو کر جسم سے چمٹا تھا۔

"ماسٹر جی آٹھ کلیوں کا کرتا بنانا ہے اور یہ گوٹ بھی لگانی ہے۔"

ٹیلر ماسٹر نے گوٹ اور کپڑا مشین پر رکھ لیا' مشین کی ڈبی کھولی اور فیتہ نکال کر

ناپ لینے کے لئے اٹھا۔ عالم کا دل ایسے اچھلا جیسے کوئی گیند ٹپا کھا کر برساتی نالہ ٹاپ کر سڑک پر چھلانگ لگا گئی ہو۔

"نئیں ماسٹر جی ناپ کی ضرورت نہیں' آپ یہ میرے کرتے کا ناپ لے لیں۔"

عالم نے عجیب قسم کا ریلیف محسوس کیا کہ ٹیلر ماسٹر نے خوشبودار لڑکی کا ناپ نہ لیا۔ لڑکی ناپ کا کرتا' کپڑا اور گوٹ دے کر اس کے پاس سے گزری تو وہ بھی غیر شعوری طور پر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد لڑکی نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور جلدی سے درزی کی دکان کی طرف دوبارہ لوٹ گئی۔

عالم پھر تذبذب میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کیا وہ بھی حکیم صاحب کی دکان پر لوٹ جائے کہ بزاز کی دکان پر کپڑا دیکھنے کی غرض سے اندر چلا جائے۔ دکان کے باہر درزی شام کی روشنی میں بٹن ٹانک رہا تھا۔ لڑکی اس کے پاس آ کر رکی اور قدرے جھک کر بولی—— "ماسٹر جی میں نے یہ کرتا بسنت کے دن پہننا ہے' یہ نہ ہو کہ آپ اسے تیار ہی نہ کریں——"

"آپ فکر نہ کریں—— کرتا تیار ہو گا۔"

عالم نے اتنا ہی سنا اور پھر کھدوں سے بچتا' جنریٹر کے شور میں اپنی دکان کی جانب چلا گیا۔ پلٹ کر دیکھنے کی اس نے جرات نہ کی۔ اس رات دکان بند کرنے کے بعد وہ پہلی بار کتابوں کے پلاٹ' کرداروں کی بنت' ادب کے خیالوں میں گم نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ہری نیلی پتنگیں نیلے آسمان پر تیر رہی تھیں۔ گہرے پیلے رنگ کے کرتے میں ملبوس لڑکی بالوں سے گرنے والی بوندوں سے گیلی تھی اور دکان میں پٹرول' موبل آئل اور گریس کی خوشبو کے بجائے پھولوں کی خوشبو پھیلی تھی—— دوسرے دن وہ بڑا شرمایا شرمایا نوید لائبریرین کے گھر پہنچا۔ دو تین کال بل بجانے پر بھی جب کوئی برآمد نہ ہوا تو اس نے مایوسی سے لوٹ جانے کی سوچی۔ اسی وقت کچھ فاصلے پر اسے نوید نظر آیا۔

"معاف کیجئے مجھے آج پریس میں دیر ہو گئی——"

نوید کو دیکھ کر عالم کو ایسے لگا جیسے کلینک میں ڈاکٹر موجود ہے اور وہ اپنی بیماری کی تشخیص کروا سکتا ہے۔

"آیئے آیئے آجایئے——"

دونوں میرون پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ تین سیڑھیاں اتر کر وہ دونوں دری پر جا بیٹھے اور نوید نے ٹیبل فین چلا دیا۔

"میں نے آپ کے لئے کچھ کتابیں رکھی ہیں——"

عالم کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"علامتی افسانے کا مطالعہ آپ کے لئے بہت ضروری ہے' آپ ادھر بھی توجہ دیں۔"

عالم خاموش رہا۔

"آپ کی طبیعت کی مناسبت سے یہ دو کتابیں اقبالیات کے سلسلے میں دھری ہیں——"

عالم اب بھی متوجہ نہ ہوا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے——؟" نوید نے پوچھا۔

"ہاں بالکل——"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ نوید کا خیال تھا کہ عالم شاید کچھ قرض مانگنا چاہتا ہے۔

"میں نے آپ کے کچھ پیسے دینے تھے——" کچھ لمحوں بعد عالم نے کہا اور جیب سے پندرہ روپے چھ آنے نکال کر دری پر رکھ دیئے اور پھر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

"گاؤں میں تو سب ٹھیک ہیں؟"

"ہاں بالکل' پرسوں میرا بھائی آیا تھا——"

نوید نے سوچا شاید کسی بہن کو طلاق ہو گئی یا باپ پر جھوٹا مقدمہ ہوا۔

"آپ کو کوئی پریشانی ہے؟——"

عالم نے پہلو بدلا اور نیم رضامندی سے کہا—— "ہاں جی—— پریشانی تو ہے——"

نوید نیک دل آدمی تھا۔ پریس میں جتنے لوگ تھے' اسے بودا بزدل سمجھتے تھے۔ ادب سے گہری وابستگی نے اسے خاموش طبع بھی بنا دیا تھا۔

"تو کیا آپ مجھے پریشانی کی وجہ بتا سکتے ہیں؟"

"ہاں—— جی—— بالکل——" عالم نے پہلو بدلا پھر قمیص کی جیب سے کاپی کا تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا۔

"یہ—— یہ پریشانی ہے——"

نوید نے حیرانی سے کاغذ پکڑا۔

"کیا میں اسے کھول سکتا ہوں یعنی—— پڑھ لوں میں؟"

عالم نے کاپی کا کاغذ واپس لے کر سر جھکا لیا تو نوید نے سمجھا شاید کوئی نوٹس ہے' دکان خالی کرانے کے ضمن میں آیا ہے۔ شاید کسی نے دھمکی دی ہو۔ کہیں سے کسی لڑکی کا محبت نامہ آگیا اور بدنامی کا خوف عالم کے درپے ہو۔

"میں یہ آپ کو پڑھ کر سنا دوں——؟"

"ضرور ضرور" نوید بولا۔

"آپ ہنسیں گے تو نہیں——"

"خواہ مخواہ——"

اب عالم نے کھنگار کر قدرے لرزتی ہوئی آواز میں اپنی پہلی نظم نوید کو سنائی۔ یہ نظم ایک ایسی لڑکی سے متعلق تھی جس کی کمر پر تازہ دھلے بالوں کی نمی تھی۔ اڑتی پتنگوں کو پیلے کرتے والی اڑا رہی تھی اور ہر طرف پیلے پھول کھلے تھے۔ نظم میں جذبہ تو اجنبی خوشبو کی طرح تھا لیکن نظم سٹائل اور وزن کے اعتبار سے کچھ ایسی پختہ نہ تھی۔

نوید اس نظم کو سنتا رہا۔ پھر اس نے اسے دو تین مرتبہ خود پڑھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگا کہ اس کی لائبریری ہی کی وجہ سے عالم ایک شاعر بن گیا اور اس طرح اس کی لائبریری نے اردو لٹریچر کی بہت بڑی خدمت کی۔ چونکہ نوید کو ویسے بھی خدمت کا شوق تھا اس لئے وہ اس معرکے کی خدمت پر بہت خوش ہوا۔ عالم اس سے ایک سطح اوپر اٹھ گیا تھا اور اب نوید اس کے فین کی حیثیت سے پاس بیٹھا تھا۔

"یہ خوشبودار لڑکی کون ہے——؟" نوید نے سوال کیا۔

"میں اس کی شکل نہیں جانتا۔"

"تعجب! آخر اسی محلے میں رہتی ہو گی——"

"رہتی تو آپ کی بستی میں ہے لیکن میں اسے پہچانتا نہیں ــــ اگر ملوں تو شکل میں دھوکہ کھا سکتا ہوں۔"

اب نوید کو یقین ہو گیا کہ شاعر کی کیمسٹری کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ اپنی سوچ میں دوسری مخلوق سے مختلف سوچتا ہے ــــ نوید کے نزدیک یہ نظم ادب کی دنیا میں ایک تہلکے سے کم نہ تھی۔ اس نے اس نظم کی فوٹو سٹیٹ کروائی' کتابوں والی شیشے کی الماری کھولی اور اس میں سکاچ ٹیپ کے ساتھ اس نظم کو شیشے کے ساتھ ایسے چسپاں کیا کہ باہر سے پڑھی جا سکے۔

اب عالم آہستہ آہستہ نظمیں لکھنے لگا۔ اس نے گاؤں سے ایف اے کیا تھا۔ انگریزی میں مہارت تو نہ تھی لیکن انگریزی پڑھنا اس کے لئے کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ڈکشنری کی مدد سے بیرونی ممالک کے لٹریچر سے بھی متعارف ہونے لگا ــــ خیال اور حافظے کی سمتیں کھلنے لگیں۔ چونکہ پہلے بھی اس کے پاس الفاظ کا خاصہ ذخیرہ اور جذبے کا کافی سیلاب تھا اس لئے اس نے رنگ رنگ کی نظمیں' غزلیں' دوہے' ہائیکو تصنیف کرنا شروع کر دیئے۔ عالم اپنے وطن کے گیت گا کر بہت خوش ہوتا۔ اس نے کئی نظمیں اپنی ماں پر بھی قلمبند کیں۔ کچھ نظمیں ظلم' ناانصافی' معاشرتی ناہمواری' طبقاتی نظام کے خلاف بھی وجود میں آئیں۔ ایک لمبی غزل نما نظم اسلاف کی شان و شوکت اور موجودہ زبوں حالی پر بھی لکھی۔ عالم کو معلوم نہیں تھا کہ بنیاد پرست ہونے میں کچھ خرابی ہے اور کوئی بنیاد پرست موروثی نقطہ نظر رکھنے کے باعث جدیدیت سے تعلق نہیں رکھ سکتا اور اس طرح ترقی کے ساتھ اس کا تعلق خودبخود ٹوٹ جاتا ہے۔ عالم چونکہ دین دار والدین کا بیٹا تھا اس لئے ترقی کی شدید خواہش کے باوجود اس نے دین سے محبت کا اظہار بھی اپنے شعروں میں شدومد سے کرنا شروع کر دیا۔ ان شعروں میں جذبہ اتنا زیادہ تھا کہ شعر چھچھانے لگتے اور جھوٹے معلوم ہوتے۔

عالم کو معلوم نہ تھا کہ ترقی کے لئے کئی قدریں' کئی مسلک چھوڑنے پڑتے ہیں۔ ایسے خیالات جن پر انسان کی پرورش ہوئی ہو' چھوڑ کر ہی ترقی ملتی ہے۔ آدمی نہا دھو کر ہی نیا چولا پہنتا ہے۔

لاہور آنے سے پہلے عالم مانگا منڈی میں رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کی زمین تھی اور وہاں کے حساب سے وہ خوشحال تھے۔ لیکن عالم مضطرب رہتا۔ وہ چونکہ مذہبی اقدار کے ماحول میں پلا تھا اور اندر باہر کی کئی چھلنیاں اس کے عام جذبوں میں روک پیدا کرتی تھیں اس لئے یہ جذبے' احساسات شدید ہو گئے۔ اس نے گاؤں میں رہ کر ترقی کے خواب تو بہت دیکھے لیکن اسے ان خوابوں کی قیمت ادا کرنے کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ رواداری کی سوچ کے بغیر ترقی ممکن نہ تھی۔ رواداری ہی انسان کو سیکولر بناتی ہے اور سیکولر ہونے پر ہی ترقی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ سوچ کو سیکولر بنانے میں' رواداری کو اپنانے میں جذبے کند چھری بن جاتے۔ آدمی بین بین چلتے ہی سرد سا پڑ جاتا۔ ایسی باتوں کے متعلق عالم نے کبھی نہ سوچا لیکن یہ چاہتا ضرور تھا کہ وہ ترقی کرے اور مذہب کے بھی تابع رہے۔ اس کی نظمیں غزلیں رسالوں میں شائع ہوں' وہ بڑا نام پائے۔ اخباروں میں اس کے انٹرویو چھپیں۔ اپنی اس خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی رسالوں میں اپنی نظمیں بھی بھیجیں لیکن دو چار ہفت روزہ رسالوں کے علاوہ اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

ایک روز جب وہ نوید کی لائبریری میں کچھ انگریزیں کی کتابیں لوٹانے گیا تو اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی بڑے شاعر کی سرپرستی کے بغیر میرا کام نہیں ہو سکے گا۔"

نوید دوسرے کے کام آنا پسند کرتا تھا اور عالم کو بستی کا سب سے بڑا انسان بھی سمجھتا تھا۔ "معراج علی عاطف صاحب سے میں تمہیں ملوا دوں گا۔ ان کی کتاب پریس میں آئی ہوئی ہے۔ میرے مہربان ہیں۔ اتنے مشہور آدمی ہیں پر خوبو چھو نہیں گئی۔ معمولی مشین مینوں کے ساتھ مل کر چائے پیتے ہیں۔ بڑی سادہ طبیعت ہے۔"

عالم کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عاطف جتنا بین الاقوامی شہرت کا شاعر کبھی اسے مل سکتا ہے' اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے' پاس بیٹھ کر بات ہو سکتی ہے۔ عالم گڑبڑا گیا۔ بات اس کے منہ سے بمشکل نکلی۔

"کب کیسے؟"

"ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ میں تمہیں لے چلوں گا۔ میرے پاس ان کا پتہ ہے۔"

عالم نے نوید کو چوم لینا چاہا' لیکن جپھی پر ہی اکتفا کیا اور قریباً بیٹھی ہوئی آواز میں کہا —— "سچ؟ —— کب لے چلو گے عاطف صاحب کے پاس؟ ——"

"میں ٹیلی فون پر کل ہی ان سے بات کروں گا۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ غریب آدمی سے بڑا جھک کے ملتے ہیں۔ شہرت کا ذرا اثر نہیں ہوا ان پر ——"

عاطف صاحب نے پیر کا دن دیا۔ پورا ہفتہ عالم نے ایسے تیاری کی جیسے کسی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہو۔ کبھی وہ اپنے لباس کی طرف توجہ دیتا' کبھی خود کلامی میں مبتلا ہو جاتا۔ عاطف صاحب سے جو بھی باتیں کہنی' سنی اور بتانی تھیں ان کو کاپی پر ایک دو تین کر کے لکھتا۔ پھر اسے یہ بھی سوچ رہتی کہ ساتھ کیا لے جائے۔ مٹھائی؟ کیک؟ پھل —— خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں لگتا۔ آخر ملاقات کی شام آئی۔ نوید اور عالم ایک دوست کا موٹر سائیکل مانگ کر ڈیفنس پہنچے۔ سیکٹر بی میں کوٹھی تلاش کی۔ کیک کا ڈبہ بہت بچانے کے باوجود ایک طرف سے ذرا پچک گیا۔ گھنٹی بجائی۔ ملازم نے دروازہ کھولا اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

عاطف صاحب واقعی بہت ملنسار آدمی تھے۔ انہوں نے نہ صرف عالم کا حوصلہ بڑھایا اور اس کی نظمیں دیکھیں' بلکہ کچھ کی تعریف بھی کی۔ عالم سارے کا سارا شکر گزاری کے جذبے میں بھیگ گیا۔ اس کے بعد پہلے تو نوید اور عالم دونوں مل کر کبھی کبھی عاطف صاحب کی کوٹھی جاتے لیکن کچھ عرصہ بعد عالم خود ہی عاطف صاحب سے ملنے لگا۔ اس کی تو خواہش ہوتی کہ عاطف صاحب کو چھوٹے موٹے کام پڑتے رہیں اور وہ یہ کام کرتا رہے۔ ڈاک خانے جا کر ایکسپرس خط پوسٹ کرانا' منڈی سے سستا پھل خرید کر کوٹھی پہنچانا' بجلی گیس کا بل ادا کرنا' ایسی کئی چھوٹی موٹی خدمات عالم بڑی خوشی سے ادا کرتا ——

ایک طرح سے گھر کا فرد ہی بن گیا۔ عاطف صاحب کی بیگم اندر بلا کر عالم سے فرنیچر اٹھوا کر گھر سیٹ کرانے کا کام بھی لے لیتی۔ عاطف صاحب کی دونوں بیٹیاں اب اسے عالم بھائی کہہ کر بلاتیں' ان کے بھی چھوٹے موٹے کام کر کے عالم خوشی محسوس کرتا۔

عاطف صاحب دل کے کھرے ملنسار آدمی تھے۔ ایک روز عالم سے بولے —— "وہ

بھائی کل فیصل آباد میں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ تم بھی چلو —— تمہارا نام تو نہیں چھپ سکتا لیکن میں کہہ کہلا کر تمہیں چانس دلوا دوں گا —— تم کچھ کلام لے آنا' بیٹھ کر Select کر لیں گے ——"

عالم کے لئے سائیکل ریپئر شاپ تک پہنچنا محال ہو گیا۔ وہ مین روڈ سے اتر کر سیدھا نوید لائبریری گیا۔ فیروزی مائل سبز پینٹ والے دروازے کی کال بل بجائی۔ نوید نے میرون پردے ہٹا کر دروازہ کھولا۔

"آہا آپ —— آیئے آیئے ——"

بڑے دنوں کے بعد عالم نوید سے ملنے گیا۔ اب وہ اس لائبریری سے کتابیں ادھار لینے کے بجائے پنجاب پبلک لائبریری کا ممبر بن چکا تھا اور وہی کتابیں پڑھتا تھا جو عاطف صاحب اس کے لئے منتخب کرتے۔ وہ دونوں کمرے میں بنی سیڑھیاں اتر کر نیچے بچھی دری پر بیٹھ گئے۔ بڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد عالم نے کہا۔

"وہ بات یہ ہے کہ میں مشاعرے پر فیصل آباد جا رہا ہوں —— عاطف صاحب کے ساتھ۔"

نوید نے ابرو اٹھا کر ایسے دیکھا گویا وہ چاند پر جا رہا ہے۔

"مبارک ہو ——"

"میں چاہتا تھا کہ آپ میرے ساتھ بیٹھ کر کچھ نظمیں غزلیں منتخب کروا دیتے' آپ کا ذوق بہت اچھا ہے ——"

پوری شام لگا کر انہوں نے بیاض میں سے چھ نظمیں سلیکٹ کیں۔ ان نظموں پر عالم نے لال مارکر سے مشاعرہ لکھ کر تاریخ بھی ڈال دی۔ ایک نظم وطن کی سرحدوں پر تھی' جس میں وطن کی آن پر کٹ مرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ اس گھوارے کو سجانے بنانے کی آرزو ظاہر کی گئی تھی۔ ایک غزل کی فارم میں لکھی ہوئی چیز میں ماں کی محبت کا اعتراف تھا اور جذبہ بے حد والہانہ اور شدید تھا۔ دو تین نظمیں مسلم ہیروز کی شان میں ترتیب دی گئی تھیں' ایسے مشاہیر جن کو اب ترقی یافتہ لوگوں نے ہیرو رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ عالم چونکہ مانگا منڈی سے آیا تھا اس لئے اسے علم نہیں تھا کہ اب لوگ دوسرے ملکوں سے ٹیکنالوجی ہی امپورٹ نہیں کرتے' ان کے ہیروز بھی

در آمد کیا کرتے ہیں۔

عالم نے ڈیفنس پہنچ کر بڑی مشکل سے بی سیکٹر کی اس کوٹھی تک کا فاصلہ طے کیا۔ اس کی سرشاری' سرخوشی اور سربلندی کا یہ عالم تھا کہ ابھی سے اس کے کانوں میں مشاعرے کی تالیاں' شائقین کے خطوط' اپنے متعلق مضامین چھپنے لگے تھے۔ وہ کوٹھی پہنچا تو عاطف صاحب گھر پر نہ تھے۔ وہ لان میں سفید کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیاض اس کے ہاتھوں میں اس طرح تھی جیسے کنپٹی میں کوئی رگ پھڑک رہی ہو۔ کچھ دیر بعد بیگم صاحب نے اسے اندر بلوایا اور کرسی پر چڑھ کر عالم نے بیڈ روم کے پردے ٹانگے۔ پھر چھوٹی باجی نے اسے رنگنے کے لئے ایک دوپٹہ اور اس کے ساتھ نمونہ دیا۔ اسے لے کر وہ ڈرائی کلینز تک گیا' واپسی پر عاطف صاحب لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

عالم نے آٹھ سات نظموں پر سرخ مارکر کے ساتھ مشاعرہ لکھ کر نیچے مشاعرے کی تاریخ بھی قلمبند کر دی تھی۔ اس وقت وہ کسی دسویں پاس لڑکی کی طرح شرما اور ہچکچا رہا تھا۔ بیاض کھول کر اس نے ایک نظم نکالی اور عاطف صاحب کے سامنے کر دی۔ عاطف صاحب نے عینک درست کی' سگار کو ایش ٹرے میں رکھا' صفحے پر نظریں جمائیں اور چند لمحوں بعد بولے "اوں ہوں بھائی' یہ نظم نہیں چلے گی۔ بڑے دھڑلے کا مشاعرہ ہے' کوئی معرکے کی چیز ہونی چاہئے۔"

"بھئی یہ نظم وطن پر ہے۔ شاعری میں سرحدیں نہیں ہوتیں—— یہ بے ملک کی ملکہ ہے—— کوئی اور دکھاؤ' جس میں یہ سیکنڈ ریٹ جذبہ نہ ہو۔ اونچی شاعری میں انسان دوستی ہوتی ہے' وطن دوستی نہیں ہوتی——"

عالم نے شپڑ شپڑ کاغذ الٹائے اور ایک غزل نکال کر عاطف کے سامنے کر دی۔ چند لمحے عاطف صاحب غزل پڑھتے رہے۔

"غزل کی فورم تو ہے لیکن موضوع غزل کا نہیں—— موضوعاتی چیز نہیں چلے گی——"

اس نے چند لمحے عاطف صاحب کا چہرہ دیکھا—— کیا انصاف' ظلم' معاشرتی مسائل پر لکھنا درست نہیں تھا؟ ایک بار پھر اس نے چند لمحے صفحے کھڑکائے۔

"یہ دیکھئے جی....."

"ناں ناں بھائی' یہ نعتیہ مشاعرہ نہیں ہے—— ابھی تمہاری پہلی پہلی اڑان ہے..... کیوں بنیاد پرست' رجعت پسند فنڈامنٹلسٹ بننے لگے ہو' ساری عمر کے لئے ٹھپہ لگوا لو گے..... نہ نام بنے گا نہ ترقی ملے گی——"

کچھ دیر اور ورق گردانی کرنے کے بعد اس نے ایک صفحہ بڑے فخر سے کھولا۔ اسے یقین تھا کہ عاطف صاحب اسے ضرور پسند کریں گے۔ چند لمحے عاطف صاحب سر بھی دھنتے رہے پھر بولے—— "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے لیکن بڑے شاعر ایسی اشتراکی نظمیں پوری شہرت ملنے کے بعد لکھتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش' غریب امیر کا جھگڑا' نظاموں کی بات دراصل نثر کے موضوع ہیں——"

عالم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ٹیپو سلطان پر ایک بڑی خوبصورت نظم نکالی—— "ناں بھائی ناں—— یہ اسلام پرستی چھوڑ دو' ڈوب جاؤ گے—— اسلام پرستی اچھے شاعر کو زیب نہیں دیتی—— اس سے ترقی کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔"

عاطف صاحب بڑے محبتی اور ملنسار آدمی تھے۔ انہوں نے عالم کی بیاض میں وہ تمام نظمیں دیکھیں جن پر سرخ مارکر سے مشاعرہ لکھا ہوا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر اعتراف نہ جھلکا۔

"ارے بھائی یہ تم کیا اٹھا لائے ہو——"

"کیوں جی——" دبی آواز میں عالم نے سوال کیا۔

"کوئی جذبے سے پر—— کوئی ہل چل مچانے والی گرم گرم تہلکہ ساز چیز لاتے——" عالم نے نظریں جھکا لیں۔ عاطف صفحے پلٹنے لگے' بالآخر ان کی نظر نظم بسنت پر پڑی اور وہ رک گئے۔

"ہاں یہ چل سکتی ہے۔ یہ سچے جذبے کی نظم ہے' متاثر کرے گی۔ تم یہی پڑھنا——"

"لیکن سر——"

"لیکن کیا؟ ساری نظم سچے جذبوں سے جھلک رہی ہے۔ تم نے جو سراپا بیان کیا

ہے اس سے ہم اپنے تخیل میں وہ لڑکی تخلیق کر سکتے ہیں۔"

"لیکن جی ــــ میں تو اسے نہیں جانتا ــــ شاید اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ جب میں لڑکی ہی کو نہیں پہچانتا تو جذبہ کیوں کر سچا ہوا؟"

"نہ پہچاننا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہی نظم چلے گی۔ یہ سچے جذبے کی نظم ہے' متاثر کرے گی ــــ تمہاری ذات کا حصہ لوگوں کو ملنا چاہئے یوں یوں ــــ"

عاطف صاحب ہوا میں اس کی ذات کا حصہ بانٹتے ہوئے اندر چلے گئے۔ عالم عجب بے بسی کے عالم میں بیاض لے کر واپس گھر پہنچا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے۔ جن جذبوں کو وہ سچے' درست اور اہم سمجھتا تھا' وہ تو یک جنبش ابرو عاطف صاحب نے رد کر دیئے تھے۔ بھلا انہیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اس کے اندر کے سچ کو اتنے وثوق سے رد کر دیں۔ لیکن عاطف صاحب کے متعلق اس ہلکی سی بغاوت پر بھی اسے بڑی پشیمانی ہوئی اور اس نے دل میں سوچا آخر میں کون ہوں؟ نہ کچھ تجربہ نہ پرفارمنس۔ عاطف جیسے لوگوں نے کچھ موضوعات' احساسات' کچھ حدود تو فکس کر ہی رکھی ہوں گی۔ انہیں معلوم ہو گا کہ کس قسم کے کام کو لوگ پسند کرتے ہیں' کون سا کام درست ہے۔

واپسی پر عالم نے چھوٹوں کو ان کی مزدوری دی۔ سامان چیک کیا' چیزیں اٹھا کر اپنا بستر ڈالا تو اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ اب وہ مشاعرے میں جانے کے لئے کچھ ایسا آرزومند بھی نہ رہا۔ اس کے دل میں کئی سوال اٹھ رہے تھے!

کیا وطن اور ماں کے متعلق جذبہ سیکنڈ ریٹ تھا؟

کیا موروثی جذبے جدیدیت کے چوکھٹے میں پراگندہ نظر آتے ہیں؟

کیا صرف ایسی نظم ہی متاثر کر سکتی تھی جس میں مرد اور عورت کا ربط ظاہر ہو؟

کیا کوئی اور جذبہ تعریف کے قابل نہ تھا؟

عالم کی تعلیم کم تھی اور وہ سوال بھی درشتگی سے پوچھ نہ سکتا تھا۔ بڑی دیر تردد میں لیٹے رہنے کے بعد وہ اٹھا۔ یکدم عالم کو محسوس ہوا جیسے وہ شاعری کی ٹیکنالوجی کو کافی اور اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ اس میں جھوٹ اور سچ کچھ اس طور ملے ہوئے تھے کہ ان کو علیحدہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ سوچتے سوچتے اسی نتیجے پر پہنچا

کہ اب اسے کوئی ایسا کام کرنا ہو گا جس میں کینچوے کی طرح آگے پیچھے آنے جانے کی قوت نہ ہو ــــ بلکہ ترقی ہو' آگے ہی آگے۔

جذبوں کی کائنات الانگ کر وہ ٹیکنالوجی کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ اس نے پمپ اٹھا کر ٹائر میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔ ایک عرصے کے بعد اسے وہ سائیکلیں نظر آئیں جو کرائے پر دی جاتی تھیں۔

دوسرے دن جب دونوں چھوٹے دکان پر آئے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی میں لوہے کی چوکور کرسی بھیگ رہی تھی۔ شاہراہ اور چھوٹی سڑک کے درمیان برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ اسی میں ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی بیاض بھی تیر رہی تھی' جس پر بارش کے قطرے ہولے ہولے برس رہے تھے۔ عالم ریپئر شاپ پر ایک مدت کے بعد عالم خود پنکچر ٹائر ٹسٹ کرنے میں مشغول تھا۔ ابھی اسے علم نہ تھا کہ سائنسی ترقی میں بھی انسان کو بہت سے جذبے پیچھے چھوڑنے پڑتے ہیں۔ بہت سے مسلک' کئی قدریں اس راستے میں بھی ہاتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ شہرت اور ترقی کا نیا چولا جب بھی پہنا جاتا ہے' بدن سے پرانی میل دھونی ہی پڑتی ہے۔

***